ملاحظات

از ایڈیٹر

میں نے ترجمان القرآن کی سابق اشاعتوں میں اسلامی ہند کے مستقبل پر جو کچھ لکھا ہے، اس میں حتی الامکان ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اسے میری قدرتِ بیان کا نقص سمجھیے کہ باوجود انتہائی کوشش کے میں اپنا نقطۂ نظر پوری طرح واضح نہ کر سکا اور اس کے متعلق فاضل مضمون نگار جیسے اعلیٰ تعلیمیافتہ اور فہیم و ذکی اصحاب کو بھی شبہات پیش آئے تاہم اب میں دوبارہ کوشش کروں گا کہ حالات کو جس نظر سے میں دیکھتا ہوں اسی نظر سے دوسروں کو دکھا سکوں اور مستقبل کے متعلق جس رائے کو میں درست سمجھتا ہوں اس کے درست ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہنے دوں۔ بحث کی تسہیل کے لیے میں نے نواب صاحب کے مضمون میں قابلِ جواب امور پر نمبر لگا دیے ہیں، اور اب نمبروار جواب عرض کرتا ہوں۔

(۱) فاضل مضمون نگار ایک طرف یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے جن تدابیر کو میں ضروری اور ناگزیر قرار دیتا ہوں، وہ "بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے"۔ دوسری طرف وہ خود اپنے اس مسلّمہ کو محض اس بنا پر رد کر دیتے ہیں کہ یہ تدابیر "بالکل ہی ناقابلِ عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں" اور "ان کے حصول میں صدیاں بھی کم ہیں"۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے نہ تو ان وجوہ کی اہمیت پر کافی غور فرمایا ہے

جن کی بنا پر میں ان تدابیر کو ناگزیر قرار دے رہا ہوں، اور نہ اس سوال پر زیادہ قوت فکر صرف کی ہے کہ ان تدابیر کو روبکار لانے اور جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غالباً وہ نہ تو اس طرح سرسری طور پر میری رائے سے اتفاق فرماتے اور نہ اس طرح سرسری نظر میں اسے ناقابل عمل سمجھ کر رد کر دیتے۔ چونکہ بحث کا اصلی اور اہم ترین نکتہ یہی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ صرف نواب صاحب ہی نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہیں، اس کے اصولی اور عملی پہلوؤں پر پوری قوت فکر صرف کریں۔

اس بحث کو اصولی طریق پر طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ میرے خیالات کا تجزیہ کیجیے اور ایک ایک جزو کے متعلق واضح طور پر فیصلہ کیجیے کہ آیا آپ کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔

۱۔ میری نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت اور دوسری ہندوستانی ہونے کی حیثیت۔ ان میں سے پہلی حیثیت دوسری حیثیت پر مقدم ہے، اس معنی میں کہ اگر بالفرض ان دونوں حیثیتوں میں مصالحت ممکن نہ ہو، اور ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہو جائے کہ ہم کس حیثیت کو دوسری حیثیت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں گے، تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت کو اس پر قربان کر دیں ——— یہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے فیصلہ پر دو بالکل مختلف و متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا انحصار ہے۔ جو شخص معنی مذکور الصدر میں دوسری حیثیت کو پہلی حیثیت پر مقدم رکھتا ہے، اس کا راستہ میرے راستہ سے بالکل الگ ہے میں اس کو مسلمان سمجھنے سے انکار کرتا ہوں، اس لیے ایک ایسے مسئلہ میں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے، اس کے ساتھ کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا میری بحث صرف ان لوگوں سے ہے جو اس بنیادی امر میں مجھ سے متفق ہیں (آگے چل کر میں لفظ مسلمان جہاں کہیں استعمال کروں گا اس سے میری مراد اسی دوسرے گروہ سے ہوگی)۔

۲۔ مسلم ہندوستانیوں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی مسلم ہونے کی حیثیت اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں کامل توافق ہو، اس ملک کا سیاسی، معاشی اور تمدنی ارتقا کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرنے پائے جس میں ہماری ان دونوں حیثیتوں کا ساتھ ساتھ نبھنا مشکل ہو جائے ——— میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہوگا۔ تاہم اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کرے۔

۳۔ مذکورۂ بالا پالیسی کو موثر اور کامیاب بنانا صرف ہمارے عمل اور ہماری قوت پر منحصر ہے۔ ہمارے غیر مسلم ہم وطن اور غیر مسلم حکمران اگر ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوں، اور انتہا درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کام کریں، تب بھی وہ اس توازن اور توافق کو قائم نہیں کر سکتے جس کے قیام پر ہماری مذکورۂ بالا دونوں حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نبھنے کا انحصار ہے۔ اس لیے کہ وہ زندگی کا اسلامی نقطۂ نظر کہاں سے لائیں گے؟ اصول اسلام کا فہم انہیں کیسے نصیب ہوگا؟ تہذیب اسلامی کی اسپرٹ کو وہ کیونکر سمجھ سکیں گے؟ پس ہر قسم کے فرقہ وارانہ تعصبات سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کے جس توازن و توافق پر مسلم ہندوستانی قوم کی زندگی کا مدار ہے وہ اس قوم کی اپنی طاقت اور موثر طاقت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے ——— کیا آپ (اور "آپ" سے میری مراد وہ سب لوگ ہیں جنھیں میرے سیاسی مسلک سے اختلاف ہے) اس کو تسلیم کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو وجوہ ارشاد ہوں۔ اگر تسلیم ہے تو یہ فرمائیے کہ آیا یہ حقیقت آپ کی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے، یا اسے آپ ایسی چیز سمجھتے ہیں کہ حاصل ہو تو بہت خوب، اور نہ حاصل ہو تو کچھ پروا نہیں، اس کے بغیر ہی آگے بڑھے چلو؟

۴۔ جس طاقت سے اس پالیسی کو موثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمانوں میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چند ایسی کمزوریاں جڑ پکڑ گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہندوستان

کے سیاسی ارتقار کی رفتار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے اس لیے میں کہتا ہوں کہ تمام دوسرے کاموں سے پہلے ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیے اور اپنے اندر کم سے کم اتنی طاقت پیدا کر لینی چاہیے کہ ہم اس ملک کے آئندہ نظام حکومت کی تشکیل میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کر سکیں۔ اس کے بغیر جنگ آزادی میں شریک ہونا اور نہ ہونا دونوں ہمارے لیے یکساں مہلک ہیں ـــــ آپ فرمائیں کہ اس بیان کے کس حصہ سے آپ کو اختلاف ہے؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جنہیں میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے؟ یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے وہ نتائج بد پیدا نہیں ہو سکتے جن کے خطرات میں نے ظاہر کیے ہیں؟ کیا آپ کی رائے یہ ہے کہ ہمیں حب وطن یا حب نفس کی خاطر ان خطرات کو گوارا کرنا چاہیے؟ ان میں سے کونسی شق آپ اختیار فرماتے ہیں؟

۵۔ وہ طاقت جس کی ضرورت میں ثابت کر رہا ہوں میرے نزدیک ان تدابیر کے سوا کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہو سکتی جنہیں اختصار کے ساتھ میں نے بیان کیا ہے ـــــ اگر آپ کو سرے سے اس کی ضرورت ہی تسلیم نہیں ہے، تب تو میرے نزدیک تدابیر کی بحث لاحاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کو اسکی ضرورت کا اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا مجھ کو ہے، تو آپ ایک مرتبہ پھر ان تدابیر کا جائزہ لیجیے اور غور فرمائیے کہ ان کے سوا اور کونسی تدبیریں ہو سکتی ہیں جو ہماری کمزوریوں کو دور کر کے ہم کو مسلم ہونے کی حیثیت سے ایک طاقتور جماعت بنانے والی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ غور فرمائینگے تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ یہ محض چند خوش آئند تجویزیں نہیں ہیں جن کی قدر افزائی کے لیے صرف اتنی سفارش کافی ہو کہ "ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے"، بلکہ درحقیقت مسلمانوں کی قومی زندگی کا تحفظ انہی تدابیر پر منحصر ہے اور اب اگر ہم خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بہرحال انہیں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب میں عملی پہلو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً

یہ سمجھا ہے کہ میں بالکل ایک آئیڈیل حالت کی طرف مسلمانوں کو لے جانا چاہتا ہوں، اور میرے نزدیک علم و عمل، اتحاد و اتفاق اور نظام اجتماعی کے آخری و انتہائی مرتبہ کا حصول سیاسی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ناگزیر ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ کام تو شائد صدیوں میں بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گا۔ اگرچہ ایسی ایک آئیڈیل حالت بھی اس سے پہلے ایک صدی کے چوتھائی حصہ میں ہندوستان کے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب، عرب جاہلیت کے حالات میں پیدا کی جا چکی ہے، لہٰذا اس کو ناممکن الوقوع کہنا درست نہیں۔ لیکن اگر اس کو ناممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ جو کم سے کم طاقت اس وقت ہمیں درکار ہے اس کے لیے صدر اول کے مسلمانوں کی سی انتہائی دین داری اور اجتماعی تنظیم تک پہنچ جانا ضروری نہیں۔ صرف اس قدر کافی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اصولوں پر ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جائے جو غیر مسلم تہذیب کے اثرات کو اپنی جماعت میں پھیلنے سے روک سکتی ہو، جس کے سامنے ایک قومی نصب العین واضح طور پر موجود ہو، جو اپنے نصب العین کے لیے اجتماعی جد و جہد کر سکتی ہو، جس میں اتنا شعور ہو کہ گمراہ کرنے والے رہبروں کو پہچانے اور ان کا اتباع کرنے سے انکار کر دے، اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ منافقت اور غداری اس کے دائرہ میں پھل پھول نہ سکے۔ یہ کام نہ غیر ممکن ہے، نہ صدیوں کی مدت چاہتا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کا بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ رہنا مشکل ہے، اور اگر ان کے نوجوانوں میں سے ایک جماعت سچے جذبہ کے ساتھ اس کام کے لیے جانفشانی اور پیہم عمل پر آمادہ ہو جائے، تو ایک قلیل مدت ہی میں ایسی ایک رائے عام تیار کی جا سکتی ہے لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم سہولت پسندی چھوڑ دیں صحیح طریق کار کی دشواریوں کو دیکھ کر ہمت ہار دینا اور دوسروں کے ہموار کیے ہوئے راستوں کو آسان دیکھ کر ان کی طرف دوڑ جانا، ایک ایسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر

خدانخواستہ یہی ذہنیت ہماری قوم پر غالب ہوگئی ہے اور ہم اس درجۂ تنزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے قومی نصب العین کے لیے کوئی اجتماعی جد و جہد کرنا ہمیں غیر ممکن نظر آتا ہے تب تو ہمیں خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔

---

(۲) یہ بات میں نے کبھی نہیں کہی کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک کے لیے ملتوی ہو جانی یا ہو جانی چاہیے جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو لیں پچھلے واقعات اور موجودہ حالت پر نظر کرتے ہوئے اس بات کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے سیاسی ارتقار کی رفتار ہمارے شریک نہ ہونے سے رک جائے گی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منتشر اور مختلف الخیال افراد کی شکل میں مسلمانوں کا شریک جنگ ہونا فائدہ سے زیادہ نقصان کے امکانات رکھتا ہے، اور یہ نقصان اُس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو کچھ مدت تک اس جنگ سے علیحدہ رہنے کی صورت میں پہنچے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنی تمام تر توجہ اس طرف صرف کرنی چاہیے کہ کم سے کم مدت میں اپنے اندر وہ طاقت پیدا کر لیں جو شریک جنگ ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اس دوران میں اگر دوسرے ان سے متعرض نہ ہوں تو انھیں بھی دوسروں سے متعرض نہ ہونا چاہیے۔

---

(۳) یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو ایک بنیان مرصوص بننے کی ضرورت ہے۔ لیکن صاحب مضمون کو نہ معلوم میرے کونسے الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں مسلمانوں کو بنیان مرصوص نہیں بنانا چاہتا بلکہ ان کے درمیان پارٹیوں کا اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو ایک ٹھوس جماعت صرف اسی طرح بنایا جا سکتا ہے کہ اس کے افراد ایک نصب العین پر متفق ہوں اور اس کے لیے ایک طریق کار اختیار کریں۔ اس غرض کے لیے ہم کو نصب العین اور طریق کار

دونوں کی توضیح کرنی پڑے گی اور جس طرح ہمارا یہ فرض ہوگا کہ قوم کے ان تمام افراد کو اپنے ساتھ ملالیں جو اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہوں، اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ناگزیر ہوگا کہ ان افراد کے ساتھ غلظت و شدت برتیں جو اپنی خودسری یا منافقت کی بنا پر اپنی قوم کا ساتھ دینے سے انکار کریں خواہ اس سے کہ وہ نئے تعلیمیافتہ ہوں یا پرانے تعلیمیافتہ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ مختلف مقاصد کے تحت مختلف اور متضاد راستوں کی طرف جانے والے افراد کو کسی طرح جوڑ کر ایک بنیان مرصوص نہیں بنایا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور کرنا ضروری ہے۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ ہم جو سیاسی جنگ میں کانگریس کے ساتھ شرکت کرنے سے انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تعطل چاہتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اپنی قوم کی منتشر طاقتوں کو جمع کرنا خود ایک جنگ ہے۔ یہ جنگ اگر ہم شروع کر دیں تو اس کے دوران میں ایک طرف ہمارے زنگ خوردہ ہتیاروں پر صیقل بھی ہوگا اور دوسری طرف ہماری منتشر طاقت جتنی جتنی مجتمع ہوتی جائے گی ملک کی سیاسی میزان میں ہمارا وزن بڑھتا چلا جائے گا اور اس کے اثرات وہی ہوں گے جو فاضل مضمون نگار کو مطلوب ہیں بخلاف اس کے اگر ہم نے یہ دیکھ کر کہ فلاں جماعت نے اتنے معرکے سر کر لیے ہیں اور فلاں گروہ اتنا طاقتور ہو چکا ہے، مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ کوئی طریق کار اختیار کیا تو یہ مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ ان کی شکست خوردگی کا ثبوت ہوگا۔

۴۔ مسلمانوں کی حالت کو ہندوؤں پر قیاس کرنا میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ ہندو قوم میں وحدت ملی کا کوئی تصور نہ تھا، ان کا سوشل سسٹم ان کو متفرق کرنے والا تھا نہ کہ مجتمع، ان کے اندر ایسی رسمیں رائج تھیں جو گھن کی طرح ان کی قوم کو کھائے جا رہی تھیں، وہ دنیا کی دوسری قوموں سے بالکل الگ تھلگ ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے اور اسی کو دنیا سمجھتے تھے۔ اس حالت میں جب وہ

مسلمانوں کے اوپر پھر انگریزوں کے زیر حکومت آئے تو اگرچہ غلامی کے ناگزیر نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے لیکن بحیثیت مجموعی ان کو نقصان سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ ان میں وحدت قومی کا ایک تصور پیدا ہو گیا، ان کو اپنے سوشل سسٹم کی بہت سی خرابیوں کا احساس ہوا جس کی بدولت متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، اور باہر سے علم و تہذیب کی جو روشنی ان تک پہنچی اس نے ان کے خیالات کی دنیا کو بہت کچھ بدل دیا۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ "ہندویت" کی اساس کسی عقیدہ اور کسی اجتماعی عمل اور کسی نظام تہذیب پر مبنی نہیں ہے، بلکہ نسل اور مرز بوم کی وحدت پر مبنی ہے، اس لیے بیرونی اثرات سے ان کے قدیم عقائد اور طرز معاشرت اور افکار و اعمال میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے ان کی "ہندویت" بہرحال برقرار رہتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے اپنے مذہب و تمدن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک ترقی پذیر قومیت کو وجود میں لا سکے۔ لہٰذا مغرب کے عمرانی و سیاسی تصورات ان کے لیے بجائے مضر ہونے کے درحقیقت مفید ہیں، یہی چیز ان کے اندر زندگی اور حرکت پیدا کر سکتی ہے، اور اسی سے ان میں قومیت کا نشوونما ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قوم اپنی ایک وحدت اور نہایت طاقتور وحدت رکھتی تھی۔ اس کا سوشل سسٹم غایت درجہ صحیح و سالم تھا۔ جاہلانہ رسوم سے یہ بالکل پاک تھی۔ اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی حضارت موجود تھی، اور یہ سب کچھ اسے صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہوا تھا جس کا نام "اسلام" ہے۔ ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ جب یہ قوم خلط ملط ہوئی، تو اس کی بلندی تو دوسروں کو پستی سے اٹھانے کی موجب ہوئی، مگر دوسروں کی پستی نے خود اس کو بلندی سے گرانا شروع کر دیا۔ اس نے دوسروں سے نسلی و وطنی عصبیت لی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اس نے دوسروں سے جاہلیت کی رسوم لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قومی طاقت کو گھن لگ گیا۔ اس نے اپنے سوشل سسٹم میں دوسروں کے طریقے داخل کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توازن اور اعتدال جو

چلا گیا جو اس سسٹم کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے دوسروں کے عقائد و افکار کو بغیر سمجھے بوجھے قبول کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنے مذہب سے دور ہٹتی چلی گئی، حالانکہ مذہب ہی اس کی قومیت اور اس کے اخلاق، تہذیب اور تمدن کا قوام تھا۔ یہی چیز آخر کار اس قوم کے سیاسی زوال کی باعث ہوئی اور اس نے حکومت کے مقام سے گر اکر اسے غلامی کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ غلامی کے دور میں جو مزید خرابیاں اس قوم میں پیدا ہوئیں، ان کو میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ مسلمانوں پر مغربی اثیلار کے اثرات اُس کے بالکل برعکس ہوئے ہیں جو آپ کو ہندوؤں میں نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں کو اس نے پستی سے اٹھایا اور مسلمانوں کو اور زیادہ پستی میں گرا دیا، اس نے ہمارے اخلاق، عقائد، تہذیب و تمدن، اور نظام معیشت و معاشرت کو جو نقصان پہونچایا وہ ان جزوی فوائد کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے ہمیں حاصل ہوئے۔

مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے اثرات کا ذکر میرے مضامین میں محض ایک ضمنی بحث کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ میں قومی امراض کی تشخیص اور ان کی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ من جملہ دوسرے اسباب زوال کے، ان اثرات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً یہ خیال کیا ہے کہ میں پرانے تعلیم یافتہ گروہ سے تعلق رکھتا ہوں اور اس گروہ کی جانب سے جدید تعلیم یافتہ گروہ پر حملہ کر رہا ہوں اس لیے میری تحریروں سے ان دونوں گروہوں میں جو اختلافات ہیں وہ اور زیادہ بڑھ جائیں گے، اور تعلیم جدید کے خلاف مسلمانوں کے جذبات میں اور زیادہ شدت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرا تعلق ان دونوں گروہوں میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ میں نے جدید تعلیم و تربیت کے نقائص پر جس قدر صاف گوئی کے ساتھ نقید کی ہے، اسی قدر صاف گوئی کے ساتھ قدیم تعلیم کی کمزوریوں اور پرانے تعلیم یافتہ حضرات کی غلطیو

بھی متعدد مرتبہ تنقید کر چکا ہوں۔ میں ان دونوں گروہوں میں تنافر نہیں بلکہ مصالحت چاہتا ہوں اور مصالحت کی صورت میرے نزدیک یہی ہے کہ ایک گروہ اپنی قدامت پرستی اور جمود کو چھوڑے اور دوسرا گروہ اہل مغرب کی اندھی تقلید سے باز آئے۔

---

(۵) "علوم جدیدہ" اور "جدید تعلیم" کے فرق کو نظر انداز نہ کیجیے۔ میں علوم جدیدہ کی تعلیم کا مخالف نہیں بلکہ شدت کے ساتھ حامی ہوں، اور بارہا اس رائے کا اظہار کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کے تنزل کا ایک بڑا سبب ان کا جمود اور ماضی پرستی میں مبتلا ہو جانا اور تحقیق و اجتہاد کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ جانا ہے لیکن زمین اور آسمان کا فرق ہے "علوم جدیدہ کی تعلیم" اور اس "جدید تعلیم" میں جو ہمارے نوجوانوں کو دی جا رہی ہے۔ حقائق فطرت کے انکشافات، اور آثار فطرت کے مشاہدات اور مسائل عمرانیہ میں فکر انسانی کے اجتہادات فی نفسہٖ اسلام کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ مسلمان کو مسلمان بنانے میں اور زیادہ مدد دیتے ہیں، اور اس کی ترقی کے لیے ان کی حیثیت ناگزیر وسائل کی ہے۔ لیکن جو چیز ان تمام علوم کو اسلام کے خلاف بنا دیتی ہے، اور مسلمان کو کفر و فسق کی طرف لے جاتی ہے وہ، وہ خاص مغربی نقطۂ نظر ہے جو ان تمام علوم کی بنیاد بن گیا ہے، اور وہ خاص طرز تعلیم و تربیت ہے جو ہماری درسگاہوں میں رائج ہے۔ اس مسئلہ پر ترجمان القرآن کی متعدد اشاعتوں میں تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔ اگر فاضل مضمون نگار ان مضامین کو ملاحظہ فرما لیں تو ان کے اکثر شبہات خود دور ہو جائیں گے (خصوصیت کے ساتھ جمادی الاخریٰ، رجب و ذی قعدہ ۵۳ھ، رجب ۵۴ھ جمادی الاولیٰ ۵۵ھ کے "اشارات" اور جمادی الاخریٰ ۵۵ھ کی اشاعت میں وہ مضمون جو علیگڈھ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم پر لکھا گیا ہے، قابل ملاحظہ ہے)۔

---

(۶) درحقیقت یہی کام میرے پیش نظر ہے جس کی طرف نواب صاحب نے اشارہ فرمایا ہے چند صفحات قبل میرے جس پروگرام کو نواب صاحب ناقابل عمل قرار دے چکے ہیں اس کا اہم ترین حصہ یہی ہے کہ مسلمانوں کے طبقۂ عوام میں اسلام کا کم سے کم ضروری علم پہونچا دیا جائے تاکہ وہ اپنے دین سے واقف ہو جائیں اور ان رسوم جاہلیت سے خود بخود اجتناب کرنے لگیں جو ان کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ان کے اندر قومی مفاد کا صحیح شعور پیدا کیا جائے، اور ان کو کم از کم اس حد تک باخبر کر دیا جائے کہ وہ قومی مفاد کی خدمت کرنے والوں اور اسے نقصان پہنچانے والوں کے درمیان امتیاز کر سکیں۔

---

(۷) "سلطنت در سلطنت" ایک مبہم اصطلاح ہے، جس کا اطلاق ایک حکومت کے حدود اقتدار میں کسی دوسرے نظام کی قوت واثر کے مختلف مدارج پر ہوتا ہے۔ اس قوت واثر کے دائرے کا وسیع یا محدود ہونا دراصل منحصر ہے اس نظام کی مضبوطی اور اس کے حاملوں کی معنوی طاقت کے کم یا زیادہ ہونے پر۔ واقعات کی دنیا میں اقلیت و اکثریت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اصل چیز نظم اور اجتماعی ارادہ کی طاقت ہے۔ اسی طاقت سے قلیل التعداد انگریز اپنے سے ہزارگنی زیادہ اکثریت پر حکمراں ہیں۔ ایک ڈیماکریٹک نظام حکومت میں بھی اقتدار اکثریت (Majority Rule) کے قاعدہ کو ایک منظم اور قوی الارادہ اقلیت بے اثر یا کم اثر بنا سکتی ہے پس یہ سوال کہ وہ "سلطنت در سلطنت" جو میں تجویز کر رہا ہوں۔ کن حدود تک وسیع ہوگی، اس حالت میں طے نہیں ہو سکتا جب کہ ہم سرے سے کوئی نظم اور کوئی اجتماعی ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ پہلے ہم کو یہ طاقت فراہم کرنی چاہیے پھر ہم جتنی طاقت فراہم کریں گے اسی کی نسبت سے "سلطنت در سلطنت" کے حدود وسیع یا محدود ہوں گے۔

---

(۸) "شبہ دارالاسلام" سے میری مراد ایک ایسا نظام سیاست ہے جو خالص "دارالکفر" کی نسبت

خالص "دارالاسلام" سے زیادہ اقرب ہو۔ ہندوستان کی موجودہ حالت یہ نہیں ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے کسی طرح کی بھی خود اختیاری حاصل نہیں۔ جو برائے نام مذہبی اور تمدنی آزادی ان کو دی گئی ہے وہ غیر مسلم حکمرانوں کی عطا کردہ چیز ہے، جس کے حدود کو کم یا زیادہ کرنا ان کے اپنے اختیار تمیزی پر موقوف ہے۔ ہمارے جن مذہبی احکام کو وہ اپنے اصول کے مطابق درست نہیں سمجھتے ان کے نفاذ کو روک دیتے ہیں، جو مذہبی احکام ان کی مصلحتوں کے خلاف ہیں ان کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتے اس کے بعد صرف وہ احکام رہ جاتے ہیں جو ان کی نگاہ میں بے ضرر ہیں۔ اُن کے نفاذ کی وہ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں لیکن اس حدود آزادی کے دائرے میں بھی ہم ان کے اقتدار کے بلا واسطہ اثر سے محفوظ نہیں رہتے انہوں نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا ہے وہ ہمارے مذہب اور تہذیب کے اصولوں کا مخالف ہے اور اس کے اثر سے ہماری نوجوان نسلوں کا ایک بڑا حصہ اُن مذہبی احکام سے بھی روگردانی کرنے لگتا ہے، جن کی بجا آوری میں ہم آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں۔ انہوں نے جو نظام معیشت قائم کیا ہے اُس کی گرفت میں ہم اس قدر بے بس ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے اسلامی اصول معیشت کی پابندی قریب قریب محال ہو گئی ہے اگرچہ ظاہر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہم کو ان اصولوں کی پابندی سے روکتا ہو۔ اسی طرح ان کا نظام عدل و قانون اور ان کا آئین حکومت ایسا ہے جو ہمارے اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز پر بلا واسطہ اثر ڈالتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہم اس درجہ بے اختیار ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی کارگر تدبیر عمل میں نہیں لا سکتے۔ ان سب پر مزید یہ کہ غیر مسلم طاقت کا اقتدار مطلق فی نفسہٖ ایک زبردست اثر رکھتا ہے۔ جو طاقت کم از کم ظاہر کے اعتبار سے رزق کے خزانوں کی مالک اور عزت و ذلت بخشنے کی مختار نظر آتی ہے، محکوم قوم اس سے تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنی وہ بہت سی چیزیں بھی اس کے قدموں میں لا کر ڈال دیتی ہے جنہیں وہ اس سے بجبر نہیں مانگتی۔ ایسی حالت جس ملک کی ہو وہ اگر خالص دارالکفر نہیں تو اس سے اقرب ضرور ہے۔ اس لیے اسے شبہ دارالکفر کہنا

چاہیے نہ کہ شبہ دار الاسلام۔

میں جس چیز کی طرف مسلمانوں کے سیاسی فکر رہنے والے لوگوں کو توجہ دلا رہا ہوں، وہ یہی ہے کہ انہیں اس حالت کو بدلنے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہیے۔ اگر اس کو بدلنا ہے تو اس کی تیاری کا یہی وقت ہے۔ انقلابی دور میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کا عمل جاری ہوتا ہے۔ اس وقت ہم نسبۃً زیادہ آسانی کے ساتھ آنے والی حالت کی شکل متعین کرنے میں اپنا اختیار استعمال کر سکتے ہیں۔ جب وہ ایک خاص صورت میں ڈھل جائیگی اور پوری طرح مستحکم ہو جائیگی اس وقت ہمارے لیے اپنا اختیار استعمال کرنے کا شاید کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ گذشتہ صدی کے ابتدائی دور میں ہم نے غفلت کی اور اس شبہ دار الکفر کو نہ صرف قائم ہو جانے دیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے اس کے قائم ہونے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بے بس ہو کر اس کی گرفت میں جکڑ گئے، اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ہمارے لیے اس کی بندشوں میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی بندش کو توڑنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ اسی سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو موجودہ رفتار پر جانے دیا، اور کوئی ایسی منظم طاقت فراہم نہ کی جس سے ہم اس کی سمت متعین کرنے میں خود اپنا اختیار بھی استعمال کر سکیں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شبہ دار الکفر کی جگہ ایک دوسرا شبہ دار الکفر لے گا، اور اس کے مستحکم ہو جانے کے بعد ہم اس کی گرفت میں بھی اتنے ہی بے بس ہوں گے جتنے اس وقت ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے تفکر کی ضرورت نہیں محض عقل عام Common Sense رکھنے والا ایک عامی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ نامساعد حالات کی طاقت کا کرشمہ ہے کہ ایسی واضح بات کو سمجھانے کے لیے بھی دلائل کی ضرورت پیش آ رہی ہے، اور دلائل کے زور سے بھی اس کو دلوں میں اتارنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو لوگ پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں وہ اگر اسے ماننے سے انکار کریں تو جائے تعجب نہیں؛ اس لیے کہ ان کی نگاہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

ان کا ضمیر تو پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ شبہ دار الکفر ہو یا خالص دار الکفر ہمیں صرف آزاد ہندوستان چاہیے جس میں ہمارے رزق کے خزانے خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ لیکن جو لوگ پہلے مسلمان اور پھر سب کچھ ہیں ان پر مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔

---

(۹) اس سے پہلے میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں اس کے بعد مجھے امید ہے کہ فاضل مضمون نگار اپنی اس رائے پر خود نظر ثانی کریں گے۔ آئینی ضمانتیں، اور ان پر اکثریت کی رضامندی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہو۔ اگر ان ضمانتوں کی پشت پر ہماری اپنی طاقت نہ ہو، تو ان کا قائم رہنا یا نہ رہنا بہر حال اکثریت کی رضامندی پر موقوف ہوگا، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے آئندہ نظام سیاست میں اکثریت کے اقتدار کی وہی حیثیت ہو جو اس وقت انگریزی اقتدار کی ہے، اور اس کے دست قدرت میں ہم ویسے ہی بے بس ہوں جیسے اب ہیں۔

---

(۱۰) اکثریت کے منظور کرنے یا نہ کرنے پر جس "سلطنت در سلطنت" کا مدار ہو وہ اس نام سے موسوم کیے جانے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کو ایک جماعت کا طاقتور اجتماعی ارادہ قائم کرتا اور قائم رکھتا ہے خواہ کوئی اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔

---

(۱۱) میں ربیع الاول ۱۳۵۶ھ کی اشاعت میں ان کم سے کم حقوق اور اختیارات کی توضیح کر چکا ہوں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں "سلطنت در سلطنت" سے میری مراد یہی حقوق اور اختیارات ہیں۔ آپ ایک مرتبہ پھر ان کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں کونسی چیز ہے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لیے ہم کو دوسری ہمسایہ اقوام کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے سے

روکتی ہو، یا ایک مشترک وطنی حکومت کے نشو و ارتقا میں مانع ہو؟ اگر ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اپنے مخصوص قومی مفاد کے لیے اس قسم کی خود اختیاری (Autonomy) طلب کریں تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں، اور ان سب کو ایسی خود اختیاری دینے کے بعد بھی ہندوستان کا مشترک نظام حکومت بخوبی چل سکتا ہے۔

---

(۱۲) یہ وہی چیز ہے جس کی طرف میں توجہ دلا رہا ہوں۔ اسی کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمان کسی ایک نصب العین پر متحد ہوں، اپنے قومی مفاد کا ایک واضح اور متعین نقشہ ان کے درمیان متفق علیہ ہو، اور کوئی ایسا نظم ان کی جماعت میں پیدا ہو جائے جس کے تحت وہ اپنے مفاد کے لیے اجتماعی جد و جہد کر سکیں۔ یہی چیز اس وقت مفقود ہے، اور اسی کا فقدان ہماری آواز کو بے اثر بنا رہا ہے۔ اگر ہماری ایک جماعت کسی چیز کو قومی حق قرار دے کر اس کا مطالبہ کرے، اور خود ہماری اپنی قوم کی ایک دوسری جماعت اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہم اپنے کسی حق کی بھی حفاظت نہیں کر سکتے اس وقت تو ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں۔ ایک گروہ کا نصب العین کچھ ہے تو دوسرے گروہ کا کچھ اور۔ ایک گروہ جن امور کو قومی مفاد سے متعلق سمجھتا ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو قومی مفاد سے کوئی تعلق نہیں، اور تیسرا گروہ اس چیز کا نام ہی سن کر "کمیونلزم" کا آوازہ کس دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ ہماری ایک جماعت کونسلوں کے اجلاس یا کانگریس کے اجتماع سے نماز کے لیے اٹھتی ہے اور اس سے دس گنی جماعت بیٹھی رہتی ہے، اور بیٹھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے بعض افراد غیر مسلموں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے والوں کی مذہبی دیوانگی پر طنز کرتے ہیں۔ اب اندازہ کیجیے کہ اس سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہماری قوم کی اجتماعی طاقت کو نقصان پہونچانے والی ہو سکتی ہے۔ اور جب حال یہ ہے تو وہ متفق آواز آپ لائیں گے ہی کہاں سے جس کے بغیر آپ خود تسلیم کرتے ہیں

کوئی آئینی ضمانت اور کوئی میثاق ہمارے لیے قابل اطمینان نہیں ہے۔

---

(۱۳) یہی کام ہے جس کو میں چاہتا ہوں کہ اسلامی اصول پر انجام دیا جائے۔ چونکہ ہمارے سامنے صرف معاشی اور سیاسی سوال ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کا بھی سوال ہے، اس لیے ہم کو اپنے جمہور کی تنظیم کرنے میں اسلامی اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ ہمارے لیے گاندھی اور جواہر لال کا اسوہ قابل اتباع نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہیے خدا پرستوں کی تنظیم کے جو اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے استعمال کیے گئے تھے۔ وہ صرف اسی زمانہ کے لیے نہ تھے، بلکہ تمام ازمنہ اور امکنہ کے لیے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے طریقے اور وسائل زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے بدل سکتے ہیں، مگر وہ اصول بجائے خود اٹل ہیں، اور آپ جس ملک اور جس زمانہ میں بھی خدا پرست قوم کی تنظیم کرنا چاہیں گے، آپ کو انہی اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ باطل کا اقتدار جب پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے، اس وقت لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان اصولوں پر عمل درآمد غیر ممکن الوقوع ہے یا اگر ممکن بھی ہے تو اس کے لیے صدیاں درکار ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غیر ممکن چیز ہر وقت ممکن ہو سکتی ہے، اور دیکھتے دیکھتے ہوا کا رخ بدل سکتی ہے۔ البتہ اس کے لیے ایک کڑی شرط یہ ہے کہ اس مشین کو صرف وہی اخلاقی طاقت حرکت میں لا سکتی ہے جو سیرت محمدی کے سرچشمہ سے ماخوذ ہو۔ جن لوگوں میں باطل سے مرعوب ہو جانے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دینے کی کمزوری موجود ہو اور جو لوگ اتنی استقامت نہ رکھتے ہوں کہ سخت سے سخت طوفانوں میں بھی راہ راست پر جمے رہ سکیں، ان کے ہاتھوں سے یہ مشین کبھی حرکت نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے لیے تنظیم کے کسی نئے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ پروگرام تو بنا بنایا موجود ہے۔ کمی صرف ایک ایسے رہنما اور ایسے چند کارکنوں کی ہے جو اپنے مقصد میں اپنے نفس اور اپنے ہوائے نفس کو فنا کر سکتے ہوں، جن کے دل نام و نمود کی بھوک

ذاتی وجاہت کی پیاس، مالِ زر کی حرص، اور نفاق و حسد کی آگ سے پاک ہوں، جن میں حق کو سربلند کرنے کا ایسا ارادہ موجود ہو جو کسی حالت میں ٹل نہ سکتا ہو اور جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے طریقہ پر نظم کے ساتھ کام کر سکیں۔

---

(۱۴) اس کے متعلق میں تصریح کر چکا ہوں۔ جمہور اہل اسلام کی قیادت اب ان لوگوں سے چھین لینی چاہیے جو چھوٹے چھوٹے مسائل پر مسلمانوں کو بھڑکا کر ہمسایہ قوموں سے لڑاتے ہیں، اور قوم کی قوت کو فضول جھگڑوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ اب قیادت و رہنمائی کے لیے ایک ایسی ترقی پسند مسلمان جماعت کو اٹھنا چاہیے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لیے اپنے غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ کھلے دل سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو، اور ان معاملات میں کسی قسم کا فرقہ وارانہ تعصب روا نہ رکھے، مگر اپنے قومی مفاد کے معاملہ میں (جس کے حدود واضح طور پر مشترک وطنی معاملات سے الگ ہوں) کسی دباؤ، کسی لالچ، کسی پروپیگنڈا کی طاقت سے اس کو مغلوبانہ مصالحت کے لیے راضی نہ کیا جا سکتا ہو۔